

اسلامی مملکت کا تصور

(اقبال کے نزدیک)

پرویز

بیاسا قی بگرواں سانگیں را بیفشاں برود گیتی آستیں را
حقیقت پر بندے فاش کر دے کہ ملا کم شناسد رمزدیں را

دین کی تاریخ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم، بصیرت افروز حقیقت بیان کی ہے جب کہا کہ
وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيَّ
أَمْنِيَّتِهِ ۚ فَبِئْسَ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ أَيْمَتَهُ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ
حَكِيمٌ ﴿۱۰۲﴾

اے رسول! تجھ سے پیشتر کوئی صاحب وحی ایسا نہیں ہوا جس کے سامنے یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ (اس کی وفات کے بعد) دین کے مخالفین نے اس کی وحی میں آمیزش نہ کر دی ہو۔ اس کے بعد خدا ایک اور نبی بھیج دیتا اور اس کی طرف وحی کے ذریعے اس آمیزش کو زائل کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا صاحب حکمت ہے۔

رسول کی وحی میں آمیزش کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خدا کا دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ دین نام تھا احکام و امتداد خداوندی کو معاشرہ میں قانونی حیثیت سے نافذ کرنے کا۔ اس کے برعکس، مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ایک پراسٹیوٹ تعلق تھا جو زندگی، پرستش یا مختلف رسوم کی رو سے انفرادی طور پر قائم ہو جاتا تھا۔ دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ ابتداء میں دین ہی تھے۔ (قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے ہر قوم میں رسول بھیجے تھے)۔ مفاد پرست گروہوں نے جن کے سرکردہ مذہبی پیشوا تھے، انہیں مذہب میں تبدیل کر دیا۔ ان مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ

يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيُشْتَرَوْا
بِهِ تَمَنَّا قَلِيلًا ۖ ﴿۱۰۴﴾

یہ خود شریعت وضع کرتے اور لوگوں سے کہتے کہ یہ شریعت خداوندی ہے۔ اور ایسا کچھ پیسے کمانے

کے لئے کرتے۔ مذہب ان کا پیشہ بن جاتا تھا۔

خدا نے رسول اللہ کی طرف جو دین بھیجا اس کے متعلق کہ دیا کہ

وَتَشْتَهِى كَلِمَاتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَقْدًا لَا مَبْدَلَ لِيَكْلِمُنِيهِمْ (۶/۱۱۶)

خدا نے اس وحی کی رو سے اپنے قوانین کو عدل و صداقت کی بنیادوں پر مکمل کر دیا ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔

اس لئے کہ

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَنَحْفَظُونَهُ (۱۵۹)

ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد وحی کی ضرورت نہ تھی، اس لئے یہ ختم نبوت کا اعلان تھا۔ کلام اللہ کے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ انسانوں کے ساتھ خدا کے مزید کلام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب خدا کے بندوں کے ساتھ کلام کرنے کا ذریعہ اس کا یہی کلام (قرآن مجید) ہو گا۔

لیکن جو کچھ دین کے ساتھ اس سے پہلے ہوتا رہا وہی کچھ اس دین کے ساتھ بھی ہوا جو قرآن میں دیا گیا تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ کیا قرآن محفوظ نہ رہا؟ کیا اس میں بھی آمیزش ہو گئی؟ اگر ایسا ہو گیا تو خدا کی اس ذمہ داری کے متعلق کیا کہا جائے گا جو اس نے اسے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے اوپر لے لی؟

نہیں! ایسا نہیں ہوا۔ قرآن کا متن تو بالکل محفوظ رہا۔ اس میں نہ ذرا سا تغیر و تبدل ہوا، نہ کسی قسم کی آمیزش! لیکن ہوا یہ کہ خارج از قرآن متعدد عناصر کو وحی کا درجہ دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن تو محض تلاوت کے لئے رہ گیا اور خارج از قرآن عناصر نے اس کی جگہ

اسلام مذہب بن گیا | لے لی اور اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اب جو کچھ اسلام کے نام سے دنیا میں متعارف ہے وہ دین نہیں بلکہ وہی مذہب ہے۔ دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے کی سب سے پہلی محسوس علامت یہ ہوتی ہے کہ اُمت میں وحدت نہیں رہتی۔ وہ فرقوں میں بٹ جاتی ہے، اور ہر فرقہ کی شریعت کی آخری سند (خدا کے ہاتھ) کوئی نہ کوئی شخصیت قرار پا جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ (۱۱۳/۱)

(جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا تو خدا ایک اور نبی بھیج دیتا تھا جو وحی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دیتا تھا۔ لیکن ختم نبوت کے بعد نبیوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اسے جاری رکھنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ رسول اللہ کے بعد خدا کی وحی (قرآن مجید) میں آمیزش نہیں ہو سکتی تھی جسے الگ کرنے کے لئے نبی کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ خدا کی آیات (قرآنی قوانین) اپنی مندرجہ شکل میں موجود تھیں۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ ان آیات کو (قرآن اللفظی میں) ”محکم کیا جائے“۔ (تَشْفِئُ يَحْكُمُ اللَّهُ آيَاتِهِ) آیات قرآنی کو محکم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں دین کی اساس قرار دیا جائے۔ انہیں حق و باطل، جائز و ناجائز، صحیح اور غلط کا معیار تسلیم کیا جائے لیکن یہ

فریضہ الفردی طور پر سرانجام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ یہ اُمت کا اجتماعی فریضہ تھا جس کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس کا جملہ کاروبار، قرآن مجید کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ کتب سماوی کے نزول کا مقصد یہی تھا۔

استحکام آیات اللہ کا عملی طریق | لِيُحْكَمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ

(۲۱) کہ لوگوں کے اختلافی امور میں ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ رسول اللہ سے بھی کہا گیا تھا کہ۔

كَأَحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (۲۲)

اس اُمت سے بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۲۳)

اگر کسی معاملہ میں تم میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا کی کتاب کی رو سے کر لیا کرو۔

حتیٰ کہ حتیٰ طور پر یہ اعلان کر دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۲۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔

لہذا، آیات اللہ کو محکم کرنے کے لئے خدا کی طرف سے کسی کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ (خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے)۔ اس فریضہ کو اُمت نے خود سرانجام دینا تھا۔ یعنی خارج از قرآن عناصر کو شریعت خداوندی قرار دینے کے بجائے کتاب اللہ کو مملکت کا ضابطہ نظام قرار دینا، اُمت کا فریضہ تھا۔ اس کے لئے کسی مامور من اللہ کی ضرورت نہیں تھی۔ خدا کی طرف سے جس نے آنا تھا وہ آخری مرتبہ آکر اور خدا کی مکمل و محفوظ کتاب دے کر چلا گیا تھا۔ (علیہ التحیۃ والسلام)

(۱)

جیسا کہ میں پہلے کہ چکا ہوں، اسلام، صدیوں سے دین کے بجائے مذہب بن چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اُمت کو بتایا جائے کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو، وہ دینی خداوندی نہیں۔ اسلام اسی صورت میں الدین کی شکل اختیار کر سکے گا جب اپنی ایک آزاد مملکت ہو اور اس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔ ہمارا زمانہ اس اعتبار سے انتہائی خوش نجات ہے کہ اس میں ایک ایسا دیدہ ور پیدا ہوا جس نے اس فراموش کردہ حقیقت کو اُمت کے سامنے پیش کیا۔ یہ تھے حکیم الامت، علامہ اقبالؒ۔ انہوں نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مامور من اللہ ہیں، یا انہیں خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ ایسا دعویٰ ختم نبوت کے منافی اور یکسر باطل تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ قرآن کریم پر جو رد و تہر اور اسوۂ رسول اللہؐ کے گہرے مطالعہ سے انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہے جسے وہ اپنی بصیرت کے مطابق قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آپ ان کے کلام کو شروع سے اخیر تک دیکھ جائیے، اس میں روشن روش پر آپ کو عظمت قرآنی کے پھول کھلے دکھائی دیں گے۔ ان کا پیام، قرآنی حقائق ہی کی تشریح و توضیح ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب سابقہ انبیاء کرامؑ دین کو اس حقیقی شکل میں پیش کرتے تھے تو نہ ہی پیشوائیت

کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے دینی مملکت کا تصور پیش کیا اور قائد اعظمؒ نے اس تصور کی عملی تشکیل کے لئے تحریک پاکستان کا آغاز کیا۔ نیشنلسٹ علماء کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت لازمی تھی کیونکہ ان کے پیش نظر تو اسلام کا وہی تصور تھا جس میں اعتقادات، عبادات، اور شخصی قوانین کی آزادی اور پبلک لاز، مغرب کے جمہوری انداز سے وضع کئے جائیں۔ ان کا اسلام کے تعلق یہی تصور تھا جس پر جامع انداز میں تنقید کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ :

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
السلام تو اسی صورت میں آزاد ہو سکتا ہے کہ جملہ قوانین مملکت، کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے
متعین کئے جائیں۔ اور یہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلامی نظام کا یہ تصور، امت کی نگاہوں
سے صدیوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ :

منزل و مقصود قرآن دیگر است رسم و آئین مسلمان دیگر است
قرآن کا نصب العین۔ اس کی منزل۔ اس کا منتهی۔ اس کا مقصود کچھ اور ہے اور مسلمانوں کا اسلام کا تصور
ان کے رسوم و مناسک، ان کا شعار زندگی، ان کا آئین حیات کچھ اور۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے
مختلف ہیں۔

بندہ مومن زشت آں بر بخود در ایاغ او نہ مے دیدم، نہ دُرد
اصل یہ ہے کہ امت مسلمہ نے قرآن کریم کے نخل حیات کا پھل کھایا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس کے ساعز
زندگی میں، قرآن کی شرابِ طہور تو ایک طرف، اس کا تہ جرعت تک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیا یہ حقیقت
انتہائی تعجب انگیز اور حیرت افزا نہیں کہ :

نور طلسم قیصر و کسری شکست خود سر تخت ملوکیت نشست
وہ قوم جس نے قیصر و کسری کی ملوکیت کو نیست و نابود کر دیا، اس کے بعد، وہ خود تخت ملوکیت بچھا کر
اس پر سندا نشین ہو گئی اور بھروسہ

تا مہال سلطنت قوت گرفت دین او نقش از ملوکیت گرفت
جب تمام ملوکیت حکم ہو گیا تو دین، تمام تر اسی کے رنگ میں نہ لگا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ — آفریدی
شرع و آئینے دگر — اسلام کی جگہ ایک مذہب، ایک نئی شریعت وجود میں آگئے۔ اب اس
کا علاج یہ ہے کہ — اند کے بانور قرآن درنگر — اپنے آئین حیات کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لو
یہی تھا وہ "نور قرآن" جس کی روشنی میں علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی تصورات
نہایت واضح الفاظ میں پیش کئے۔ آج کی نشست میں، میں اس کے مختصر سے خط و خال آپ کے سامنے
پیش کروں گا۔ اس ضمن میں، ان کے سات لیکچروں کے مجموعہ میں سے چھٹا خطبہ، اور سنہ ۱۹۳۳ء کے مسلم لیگ
کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کا خطبہ صدارت، خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ میری یہ تصریحات بیشتر
انہی اقتباسات پر مشتمل ہیں۔ یہ خطابات انگریزی زبان میں ہیں۔ یہاں ان کا اردو ترجمہ پیش کیا جائے گا

کیونکہ لفظی ترجمہ سے مفہوم سمجھ میں نہیں آسکے گا۔

(۲)

آپ نے ۱۹۳۰ء کے خطبہ صدارت میں فرمایا:-

الہ آباد کا خطبہ صدارت | آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ

عقیدہ رکھتا ہے اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ و پائندہ قوت ہے جو انسانی نگاہ کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے ایک فطری وسعتوں میں اذنِ بال کشتائی دے گا۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دین، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین قوت کا حامل ہے اور جسے اس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیرِ الہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی، اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویہ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز نہ خیال فرمائیے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ کوئی نظری مسئلہ ہے۔ نہیں۔ یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفسِ اسلام پر بحیثیت ایک نظامِ حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں۔

اس تہذیب کے بعد انہوں نے مذہب اور دین کے فرق کو ان الفاظ میں نمایاں کیا۔ فرمایا:-
حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک کلیسائی نظام نہیں جس کا مقصود خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ قائم کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی مہیئت ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس نظام کا نتیجہ اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روستو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ ان نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رُو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح یا بگل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطہ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدریت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ وہ ایک مثالِ مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اس نظری بحث کے بعد وہ اُس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تہذیب اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:-

ہندوستان دنیا بھر میں بہت بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام پر حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے مسلمانان ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں، کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے، (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا)۔ اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:-

تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندانی توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی ایشیہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس نقطہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطہ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالم اسلام پر کیا اثر ہوگا۔

ان کی بصیرت نے یہاں تک کہہ دیا کہ

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔

سچ کہا تھا اس دیدہ ور نے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردہ اندک میں ہے عکس اس کا میرے آئینہ ادراک میں ہے

اُس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے علی حل یہ بتایا کہ

پاکستان کا ہیولی | میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقتدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اس مملکت کے قیام سے ہوگا کیا؟ فرمایا کہ

اس سے اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کہ جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر ثبت ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے یہ نہ صرف اپنی حقیقی روح سے قریب تر ہو جائیگا بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی ہم دوش ہو جائیں گے۔

ط اُس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی ہی تعداد تھی۔

اسی حقیقت کو انہوں نے اپنے خطبات تشکیل مجدد (کے چھٹے خطبہ) میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں، ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

اندریں حالات ہمارے لئے کشادہ کار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینہ اسلام پر غیر اسلامی رنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامہ ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سر نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیل جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے مملکت پاکستان کا جو نظریہ اور تصور پیش کیا تھا اس کی غرض و غایت اور منہبھی و مقصود کیا تھا؟ انہوں نے یہ تصور سن ۱۹۳۷ء میں پیش کیا تھا۔ (اگرچہ خطبات تشکیل جدید اس سے بھی دو سال پہلے دیئے گئے تھے) حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کا سارا کلام اور پیغام انہی تصورات کی توضیح و تشریح ہے۔

(۰)

اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک، واحد اور غیر منقسم امت ہوتی ہے جو دین کے اشتراک کی بنا پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں نہ مذہبی فرقے ہوتے ہیں، نہ سیاسی پارٹیاں۔ نہ اس کی "پارلیمنٹ" میں حزب اقتدار اور حزب مخالف کی تقسیم تفریق ہوتی ہے۔ اس مملکت یا امت کا ایک ضابطہ قوانین ہوتا ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق ہوتی ہے، اور نہ ہی کوئی گروہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنی الگ فقہ کی پیروی کرے گا۔ ایک مملکت کے اندر الگ الگ ضوابط قانون کی پیروی تو مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہوتی ہے جسے کبھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن جس مملکت کی تشکیل کا نظریہ علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا، ظاہر ہے (اور انہیں اس کا علم تھا) کہ اس میں مسلمانوں کے متعدد فرقے ہوں گے۔ سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطہ قوانین مرتب کس طرح ہو سکے گا جس کا اتباع تمام مسلمان یکساں طور پر کریں؟ سیکولر حکومت میں تو یہ مسئلہ بڑا آسان ہوتا ہے۔ اس میں مختلف مذاہب یا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے پیروں کو، اپنے اپنے پرسنل لاز کی آزادی ہوتی ہے اور مملکت کے پبلک لاز کے وضع کرنے میں مذہب کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت تو سیکولر نہیں ہوتی۔ اس میں اس قسم کی تفریق کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ بنظر غائر دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان کے بیشنسٹ علماء کے سرخیل (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبالؒ کے درمیان مشہور معرکہ دین و وطن مملکت اسی (دو) جداگانہ تصورات کا پیدا کردہ تھا۔

نیشنلسٹ علماء سیکور حکومت کے مؤید بنے اور علامہ اقبالؒ اسے اسلام کے یکسر خلاف قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے ایک ملک، ایک مملکت کے مطالبہ کی بنیاد ہی یہ تھی کہ مہندوستان کی سیکور حکومت کو خلاف اسلام سمجھتے تھے۔ ان تصریحات سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آگئی ہوگی کہ علامہ اقبالؒ نے جب اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا تو ان کے سامنے بنیادی اور اہم ترین سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطہ قوانین کس طرح مرتب ہوگا جس میں پرسنل اور سبک لازم کی تفریق نہیں ہوگی اور جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ انہوں نے اپنے خطبات تشکیل جدید کے چھٹے خطبہ میں اس نہایت اہم اور نازک ترین مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے جس کے ضروری اقتباسات ذرا آگے چل کر سامنے آئیں گے۔

(۰)

لیکن کسی مملکت میں قرآن قوانین و احکام کو میکانیکی طور پر نافذ کر دینے سے وہ مملکت اسلامی نہیں بن جاتی۔ مملکت کے اسلامی بننے کی اولین شرط یہ ہے کہ اس کے افراد میں حکمت قرآنی کے مطابق نفسیاتی تبدیلی واقع ہو۔ ان کے قلب و دماغ میں قرآنی خطوط پر تغیر رونما ہو۔ یہ شرط خود قرآن مجید کی عائد کردہ ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ **إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا أَمْرَهُمْ** (۱۳۱)۔ "کسی قوم کی حالت کو، کوئی اور تو ایک طرف، خود خدا بھی نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تغیر نہ پیدا کر لے۔ علامہ اقبالؒ کا سارا پیغام، اسی تغیر نفس کی شرح ہے جسے وہ تعمیر و استحکام خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ وہ (جاوید نامہ میں) کہتے ہیں کہ یہ

ناش گویم آنچه در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزی دیگر است
چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

"چوں بجاں در رفت" سے مراد، قرآنی حکمت کے مطابق نفسیاتی تبدیلی ہے۔ (تصوف کا ترکیبی نفس نہیں) خارجی تبدیلی سے داخلی تبدیلی کے مطابق رونما ہوتی ہے۔ اسی کو وہ ناش تر الفائد میں یوں بیان کرتے ہیں کہ یہ

تیرے ضمیر یہ جب تک نہ ہو نزول کتاب!
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشف

(بال قبریل)

انسانی ضمیر پر نزول کتاب سے مراد بھی، قرآن کے مطابق تغیر نفس ہے۔ یہ مقصد، قرآنی حقائق کو اس طرح تعلیم و تربیت کی بنیاد بنانے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ اس سے افراد ملت کا قلب و دماغ قرآن سانچے میں ڈھل جائے۔ اسی لئے وہ قرآن کے متعلق کہتے ہیں کہ

آنچه حق می خواهد، آں سازد ترا

"وہ تجھے ویسا انسان بنادیتا ہے جیسا انسان خدا چاہتا ہے۔ اور یہ مقصد احکام قرآنیہ کو میکانیکی طور پر نافذ کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ

نیت ایں کار فقیہاں لے پسر

”یہاں قانون سازوں کے بس کی نہیں“ یہ مقصد قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز نبوت ہی سے حضور نبی اکرم ﷺ کا فریضہ — یُعَلِّمُھُمْ اَلْکِتَابَ وَ اَلْحِکْمَۃَ قَدْ یُزَکِّیْہُمْ — قرار دے دیا گیا تھا۔ یعنی آپ، کتاب و حکمت کی تعلیم سے افراد کی تعمیر خودی کرتے تھے۔ تشکیل مملکت کا مرحلہ تو اس سے کہیں بعد جا کر آیا تھا۔ اور قرآنی مملکت قائم بھی انہی افراد کے ہاتھوں ہو سکتی تھی جن میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر پیدا ہو چکا ہو۔ حضور کی تیرہ سالہ مکی زندگی اسی پروگرام کی پہلی کڑی تھی۔ یعنی افراد کی تیاری جن کے ہاتھوں اس مملکت کو قائم ہونا تھا۔

(۱)

لیکن مملکت کا کاروبار تو بہر حال قوانین کی رو ہی سے چلتا ہے اس لئے اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور علامہ اقبالؒ نے بڑی شرح و بسط سے اس پر گفتگو کی ہے۔ اصولی طور پر وہ باصرار دیکھ کر اس حقیقت کو دہرائے جاتے ہیں کہ اسلامی مملکت کے آئین و قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہوگا۔ وہ اپنی پہلی مثنوی (اسرار و ربوز) میں کہتے ہیں کہ

بیچ می دانی کہ آئین تو چیست زیر گردوں ستر تمکین تو چیست
آں کتاب زندہ مستر آں حکیم حکمت اولایزال است و قدم!

لیکن قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ اس نے (بجز چند احکام) اصول اور حدود و متعین کر دیئے ہیں اور جزوی اور تفصیلی قوانین خود ہی مقرر نہیں کر دیئے۔ اسے اس کتاب کی وارث امت (یعنی ان کی مملکت) پر چھوڑا ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، تفصیلی قوانین خود وضع کرے۔ یہ حدود و اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر وضع کردہ قوانین میں، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی جاسکے گی۔

جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام قوموں کے لئے ابدی اور غیر متبدل ضابطہ راہ نمائی قرار پانا ہو، ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جسے علامہ اقبالؒ نے بڑی شد و مد سے دہرایا ہے۔ وہ خطبات تشکیل جدید (کے چھٹے خطبے میں) کہتے ہیں:-

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کل کی روحانی اساس، انہی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود، تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل

ثبات و تغیر کا امتزاج اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی تو وہ محکمہ سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکاسکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے مطابق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔ وہ

تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصل بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کونسا اصول حرکت کا فرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہاد کو مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

سنی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظام شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو اور جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانون شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس وجود تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ میں ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں:-

آئیے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی روش سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہانے، قانون شرعی کے متعدد نظام (سیسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہان کی بالغ نظری کا رہین منت تھا۔ چنانچہ ناں کہ تیر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی ایسی قوم نہیں جس کے پاس اس قدر

احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام سہم گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعمہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہاد مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (کچیلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علمائے اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیا کے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں تکرار انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھنا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تادیلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرا سمجھا یا کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصول اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو ان کا حق ملنا چاہیے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلام کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ

تاریخ کا فحشہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جادو اور متصنّب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔

اور اس نمکتر کی قشرِ سرخ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افریقہ ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود و رتسا پل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افترا" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی نکستی آزادی کو اپنے خود ساختہ معبودوں کی (نذر کر دیا تھا یہ بھی

اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسٹی (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:-
اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو
زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں
بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس
معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ
منتقدین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے حقیقت
یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیروں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں
کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ
موجود ہے۔ (جو منتقدین کے پاس نہیں تھا)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابل
تغیر نہیں۔ اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں از بس ضروری اور
ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ
ہر قسمی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقابلِ گفتگو کے لئے تیار نہیں
اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔
لیکن انہوں نے کہا کہ

بایں ہمہ، میں مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔
سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ قرنِ اول سے لے کر عباسیوں کے
زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔

(۱)

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال
سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاء و حضرات کی طرف ہوتی ہے، لیکن جب بات ان ارشادات
و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف کی جائے، تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت
ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے، بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبدا و فیض کی یہ انتہائی گرم گتری تھی کہ
اس نے علامہ اقبالؒ کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر
کبھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں:-

احادیث کی قانونی حیثیت | احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت
قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں
رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم
واجہ پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہؐ

نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرمادی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور
 معلوم کیا جاسکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے
 رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ
 نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما
 دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہ نے بڑی
 عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ پیغمبر انہی طریق
 تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص
 طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا
 ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دئے جاسکتے
 ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مسک زندگی کے لئے جس قسم
 کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے
 اور انہیں ایک عالم گیر شریعت کے لئے بطور ذخیرہ استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے
 وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام ندرج انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں
 لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت
 اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی گود سے رسول کے احکام، اس قوم کے لئے خاص ہوتے
 ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی
 نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہ نے (جو اسلام
 کی عالم گیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں
 نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے
 ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے
 نقطہ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے تدوین فقہ میں احادیث
 سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں
 ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود
 نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب
 ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے
 تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت
 سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام
 احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث
 کے متعلق جی کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہؒ کا یہ طریقہ عمل بالکل معقول اور مناسب

تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مفتی یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرز عمل امام ابو حنیفہ کے طرز عمل کے ہم آہنگ ہو گا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقنین میں ہوتا ہے۔

احادیث کے متعلق امام ابو حنیفہ کا یہ طرز عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضور نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، بذریعہ وحی متعین نہیں ہوئے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکم خداوندی تھا کہ

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ..... (۱۵۹) ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا، اور حضورؐ کے بعد جماعتِ مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ

وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ..... (۱۶۰) یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔

یہ طریق عمل دورِ خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ اُس وقت تک یہ بات کسی کے حیطہ و خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصور خلافتِ راشدہ کے بعد پیدا ہوا۔

احادیثِ رسول اللہؐ (اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصور امام مالکؒ اور اُن سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا۔ اس مسلک پر حنفی فقہاء نے کڑی تنقید کی اور قیاس کو قانون کا ماتخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی روش سے اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا۔ علامہ اقبالؒ اُس کی نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :-

انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع پزیر آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصول قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعات) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا مکتبِ فقہ جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا، اپنے خاص الخاص اصول فقہ

میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہب فقہ و تشریح کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :-

لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہد رسالتؐ اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

(۱)

ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدل قرآنی احکام و اصول و حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے، یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے، ان میں تغیر و تبدل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہوگی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ

وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے (ترکی کے) اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے یہ ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی ہے۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرہ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرہ

روح عمری

جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں :-

اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دوسرے حاضر کے مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیل جدید کرے، اور وہ

عالم گیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئے۔

(۰)

گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت کا بننا جس میں تمام کاروبار مملکت قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائیں۔ یہ مملکت قائم بھی ان افراد کے ہاتھوں ہوگی جن کی سیرت قرآن غالب میں ڈھل چکی ہوگی۔ اس مملکت میں قانون سازی کا اصول یہ ہوگا کہ قرآن مجید کے اصول، اقتدار قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے اور انہیں رد و عمل لانے کے لئے جنرل قواعد زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔ یہ قواعد خود اسلامی مملکت کے مقصد ہیں اس قسم کی حکومت قائم کرنے کے لئے انہوں نے مملکت پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اس مملکت کے قیام کا اولین مقصد یہ تھا کہ ہمارے دور ملکیت میں جو قسم کا اسلام وجود پذیر ہو گیا تھا اسے مٹا کر اس کی جگہ قرآنی اسلام رائج اور نافذ کیا جائے۔ ہمارے دور ملکیت کا اسلام ان فقہی احکام میں ملبوس چلا آ رہا تھا جس کی علمبردار مذہبی پیشوائیت تھی۔ مذہبی پیشوائیت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ان فقہی احکام کو غیر متبدل قرار دیکر انہیں مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کیا جائے۔ اس انداز حکومت کو تقیہ کر لیا گیا ہے اقبالؒ نے بالفاظ دیگر مملکت پاکستان کا تصور اس لئے دیا تھا کہ مسلمانوں میں تقیہ کر لینی باقی رہے۔ وہ تمام عمر تقیہ کر لینی کے خلاف مصروف جہاد رہے۔ انہوں نے (مولانا) اکبر شاہ خان خلیفہ آبادی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا۔

تقیہ کر لینی کے خلاف

آپ نے لکھا فرمایا ہے کہ پیشیہ درویشوں کا اثر مسید احمد خان کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا۔ مگر خلافت کیٹی نے اپنے پرنسپل فتوؤں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ (انشاء اللہ شائع ہوگا) مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔ بہر حال اس تمام معاملہ کے متعلق مفصل گفتگو ہوگی جب آپ لاہور تشریف لائیں گے ہندوستان میں بالخصوص آجکل بہت سوچ کر قدم اٹھانا چاہیے۔ (انوار اقبالؒ - ص ۳۱)

انہوں نے ۱۹۳۲ء میں (پاکستان کا تصور دینے کے بعد) اپنے ایک بیان میں جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

تہا سے دین کی عظیم الشان بلندی فطری ملاؤں اور فقیہوں کے فرسورہ ادھام میں جھکری ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے بدعانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو عددیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے۔ اور ہم بڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ پھر وہ نئی آرزوؤں نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائیں۔ (بحوالہ طلوع اسلام - مئی ۱۹۷۵ء)

یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا تھا، اور قائد اعظمؒ کی مساعیٰ حسنہ نے اسے حاصل کر دکھایا تھا۔ اس کے بعد اس خطرہ زمین پر کیا بیٹی، اس کے متعلق اقبالؒ کے ان الفاظ سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ ع۔ صورت آئینہ سب کچھ دیکھو اور خاموش رہو

(۰)